جائے پناہ

طاہر جاوید مغل

تکلف برتنا اچھی بات ہے مگر کبھی کبھی تکلف برطرف کرنا کس قدر ضروری ہوجاتا ہے اس کا اندازہ مصنف کی اس تحریر کو پڑھ کر ہو گا کہ ایک مجبور انسان کو قسمت کیسے تگنی کا ناچ نچاتی ہے ...... جس کی خاطر یہ سارا چکر تھا وہ بھی اسے انگلی پر نچانے والی تھی ...... کیونکہ وہی تو گھروالی تھی۔

بھوک سے بلبلاتے ایک عاشق کی دلچسپ اور انوکھی کارفرمائیاں

میرا نام سلیم ہے۔ والد صاحب یوں تو اخبار میں کام کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انہیں ہومیوپیتھی کا شوق بھی ہے۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں۔ وہ مریضوں سے عام طور پر اتنے ہی پیسے لیتے ہیں جو دواؤں پر خرچ ہوئے ہوتے ہیں۔ تاہم کھاتے پیتے خواتین وحضرات سے وہ معقول معاوضہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں پر سستی دوا کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ دوا جتنی مہنگی ہوتی ہے اتنی ہی پرتاثیر ہوجاتی ہے۔

میں اب بالغ تھا بلکہ کافی سے زیادہ بالغ تھا۔ بی بی اے کرچکا تھا اور ایک پرائیویٹ ادارے میں گزارے لائق ملازمت بھی مل گئی تھی۔ ہر آتی جاتی لڑکی مجھے اچھی لگتی

تھی۔ "آتی جاتی" پر زور دے رہا ہوں تاہم کھڑی اور بیٹھی ہوئی لڑکی پر سے بھی نظر ہٹتی نہیں تھی۔ بس یہ دور ہی ایسا ہوتا ہے۔ رشتے کی تلاش جاری تھی مگر رشتہ مل نہیں پا رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔

والد صاحب نے گھر کے ڈرائنگ روم کو ہی جز وقتی کلینک بنایا ہوا تھا۔ میں اس امید پر کلینک کے اردگرد چکراتا رہتا تھا کہ شاید کوئی ایسی مریضہ نظر آجائے جس سے میں اپنا علاج کرا سکوں۔ لیکن کوئی ایسی "معالج مریضہ" نظر نہیں آرہی تھی اور میری "تکلیف" روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک نہایت موٹی خاتون تشریف لائیں۔ ڈرائنگ روم میں ایک دو خاموش طبع مریض بیٹھے تھے۔ والد صاحب ابھی دفتر سے آئے نہیں تھے۔ موٹی خاتون کو دیکھ کر میرے دل میں لڈو سے پھوٹ گئے کیونکہ خاتون کے ساتھ ایک پری چہرہ بھی تھی جیسے تند و تیز آندھی کے ساتھ بارش کی ہلکی سی پھوار ہوتی ہے۔ والد صاحب بہت چاہتے تھے کہ میں دواؤں اور ان کے اثرات وغیرہ میں دلچسپی لوں لیکن میری دلچسپی براہ راست مریضوں میں تھی اور خاص طور پر خواتین مریض مگر اس روز ایک دم میرے اندر دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ پوری آب و تاب سے بیدار ہوگیا۔ میں پھرتی سے والد گرامی کی کرسی پر جا بیٹھا۔ فربہ خاتون اور میرے درمیان مکالمہ ہوا۔

"جی فرمائیے۔"

"ڈاکٹر صاحب، میرا ایک مسئلہ ہے، میں بیٹھے بیٹھے...... ایک دم بے ہوش ہوجاتی ہوں۔"

جی چاہا کہہ دوں کہ کیا آپ اس وقت اپنی بے ہوشی کا نمونہ دکھا سکتی ہیں؟ اور اگر وہ "ہاں" کہہ دیں تو پھر...... میں جی بھر کر اس پری چہرہ کو دیکھ سکوں گا جو ان کے ساتھ وارد ہوئی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے نہ میں یہ بات کہہ سکتا تھا اور نہ وہ اس پر عمل کرسکتی تھیں۔ لہٰذا میں نے ماہر معالج کی طرح اپنی خیالی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "آپ نے کہا ہے کہ آپ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوجاتی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"تو کیا کبھی کھڑے کھڑے یا لیٹے لیٹے بھی ایسا ہوا ہے؟"

"جی، میں سمجھی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ کیا اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے؟"

"مہینے میں دو تین بار تو ضرور ہوتا ہے۔ ایک دم ڈر جاتی ہوں، دل کی دھڑکن یک دم بہت تیز ہوجاتی ہے۔ سانس پھول جاتی ہے اور پھر کچھ خبر نہیں رہتی۔"

"اوہو۔" میں نے بڑی تشویش سے ہونٹ سکیڑے، اور اس بیماری کا کوئی خوفناک سا نام سوچنے میں مصروف ہوگیا۔

ایک جلترنگ کی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ پری چہرہ کی آواز تھی "دراصل جی، ان کا دل بڑا کمزور ہوگیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت زیادہ اثر لے لیتی ہیں۔"

"آپ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میری امی ہیں جی۔ ہم گوجر خان سے آئے ہیں۔ بڑا نام سنا ہے آپ کا۔ میرے بڑے بھائی بھی ساتھ آنا چاہتے تھے لیکن کل شام وہ موٹر سائیکل سے گر گئے۔ پاؤں پر چوٹ آئی ہے۔"

"یہ تو اچھا ہوا۔" میں نے خلوص دل سے بے اختیار کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مم...... میرا مطلب ہے کہ اچھا ہوا آپ یہاں آگئے، سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ "یہ امی کی تکلیف آخر ہے کیا؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اس کو ڈاکٹری زبان میں میٹو ہارٹی ڈیٹی فوسیا کہتے ہیں جی۔"

اپنی بیماری کا اتنا رعب دار نام سن کر فربہ خاتون کا چہرہ کچھ اور زرد ہوگیا، وہ ہکلائیں "یہ کیا ہوتا ہے؟"

یہ تو خود ہمیں بھی پتا نہیں تھا۔ اور پتا ہوتا بھی کیسے؟ یہ نام ابھی ابھی ہم نے خود ہی گھڑا تھا۔

"آپ اس بارے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔ قدرت نے ہر بیماری کا علاج رکھا ہوا ہے۔ بس...... بنیادی طور پر...... یہ...... دراصل...... نظام ہضم کی بیماری ہے۔ بعدازاں اس سے نظام تنفس بھی متاثر ہوجاتا ہے۔ یہ دونوں نظام مل کر جگر کو متاثر کرتے ہیں اور پھر نظام اعصاب میں گھس جاتے ہیں......" میں نے بے پر کی اڑائی۔

ماں بیٹی نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ میں نے بات جاری رکھی۔ "جب دونوں نظام مل کر نظام اعصاب میں گھستے ہیں تو نظام تنفس کی ساری چربی معدے میں چلی جاتی ہے...... اور لبلبے کا فعل خراب ہونے لگتا ہے۔"

"نظام تنفس کی چربی......" پری چہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے تدبر سے سر ہلایا۔

"چربی تو شاید خون میں ہوتی ہے۔" انہوں نے اعتراض کیا۔

"یہ ابتدائی اسٹیج میں ہوتا ہے۔ بعد میں وہی ہوتا ہے جو میں بتا رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں والد صاحب آجاتے ہیں۔ وہ آپ کی امی کو اچھی طرح دیکھ لیں گے اور انشاء اللہ بالکل ٹھیک کردیں گے۔"

"تو...... تو آپ ڈاکٹر نہیں ہیں؟" پری چہرہ نے حیران ہوکر پوچھا۔

"میں بھی ہوں لیکن وہ سینئر ہیں اور سینئر تو سینئر ہی ہوتے ہیں جی۔ اس کے علاوہ......"

میری گفتگو کو بریک لگ گئے کیونکہ والد صاحب تشریف لے آئے تھے۔ میں ان کی کرسی سے اٹھ گیا۔ والد صاحب اور دونوں خواتین میں بات چیت شروع ہوگئی۔ میں دائیں بائیں ہوگیا۔

تو یہ تھی پری چہرہ سے میری پہلی ملاقات۔

......اگلے دو تین مہینے کافی خوشگوار ثابت ہوئے۔ میں نے پری چہرہ اور اس کی والدہ کے بارے میں کافی کچھ جان لیا تھا۔ پری چہرہ کا نام فرزانہ تھا۔ وہ اپنے تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس سے چھوٹا صرف ایک بھائی تھا جو کرکٹ کا شیدائی تھا۔ بڑے بھائی نوازش صاحب والد کے ساتھ گارمنٹس کا کام کرتے تھے۔

میری دعاؤں اور والد صاحب کی دواؤں میں تاثیر تھی یا فرزانہ کی والدہ آنٹی حمیدہ ٹھیک ہونے لگیں۔ جوں جوں وہ ٹھیک ہوتی گئیں، میری کامیابی کے امکانات بڑھتے گئے اور اس علاج معالجے کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ فرزانہ سے میری منگنی ہوگئی۔ کون کہتا ہے کہ ہومیو پیتھی سست طریقہ علاج ہے۔

باقاعدہ منگنی سے پیشتر میری اور فرزانہ کی دو تین محبت بھری ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ایک ملاقات گھر سے باہر اور دو گھر کے اندر۔ اب آنٹی حمیدہ، امی کی سہیلی بن گئی تھیں اور والد صاحب کی مسیحائی پر انہیں پختہ یقین بلکہ اعتقاد ہوگیا تھا۔ والد صاحب نے بھی انہیں پورا یقین دلا دیا تھا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ درحقیقت یہی یقین میری اور فرزانہ کی منگنی کا سبب بنا تھا ورنہ شکل صورت کے اعتبار سے فرزانہ مجھ سے کافی بہتر تھی۔ ان کی مالی اور خاندانی حیثیت بھی زیادہ تھی۔

اب میں اس روداد کے اصل پہلو کی طرف آتا ہوں جو خاصا دردناک ہے...... اس کا دورانیہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے کا ہے اور مقام ہے گوجر خان کا وہ گھر جہاں مجھے دلہا بن کر جانا تھا۔ شروعات اس واقعے کی یوں ہوئی کہ شومئی قسمت مجھے دفتر کے ایک کام سے جہلم جانا پڑا۔ جہلم اور گوجر خان کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ والدہ صاحبہ نے کہا کہ "تمہارے ہونے والے سسر کافی دن بیمار رہے ہیں۔ جہلم جاؤ تو ان کی بیمار پرسی بھی کر آنا۔"

ویسے تو میں کم کم ہی کسی کی بیمار پرسی کرتا ہوں لیکن اس دن تو ایسا لگا کہ دنیا کے ہر صاحبِ فراش کے لیے میرے دل میں ہمدردی کا سمندر ہلکورے لینے لگا ہے۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ اس سے پہلے میں نے دکھی انسانیت کے لیے اس انداز سے کیوں نہیں سوچا۔ میں اس موضوع پر جتنا غور کرتا گیا، معرفت کے اتنے ہی دروازے کھلتے گئے۔ مجھے چند ہی گھنٹے میں یوں محسوس ہونے لگا کہ حقوق العباد میں بیمار پرسی افضل ترین عمل ہے اور یہ عمل جہاں، جس وقت اور جس کے ساتھ بھی کیا جاسکے فوراً کرنا چاہیے اور اگر اپنے سسر کے ساتھ ہوسکے تو اس سے احسن اور کوئی بات ہی نہیں ہے۔

میں نے فوراً ٹیلی فون پر تیس روپے حرام کیے اور اپنے سسر ہاشم صاحب کی دکان پر فون کھڑکا کر ان کے منجھلے بیٹے کو اطلاع دے دی کہ میں کل شام سات آٹھ بجے ان کے گھر قدم رنجہ فرماؤں گا۔ وہ کافی خوش ہوا۔

یہ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ یعنی سخت سردی۔ مختصر ترین دن اور طویل ترین راتیں۔ میرا خیال تھا کہ میں چار پانچ بجے تک دفتری کام سے فارغ ہوجاؤں گا اور بڑے آرام سے سات آٹھ بجے تک فرزانہ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ مگر دفتری کام میں دیر ہوگئی۔ جو افسر ملا وہ افسر ہی نہیں تھا، اس کے ساتھ "دہ" کا لاحقہ بھی تھا یعنی "افسردہ" بلکہ افسردہ ترین۔ اس آدم بیزار اور عورت پرست شخص نے قریباً ایک

گھنٹا اپنی سیکریٹری کے ساتھ دفتر میں گپ شپ کی اور میری "اسائنمنٹ" پر آخری نظر ڈالنے میں تاخیر کردی۔

میں بذریعہ بس دس بجے گوجر خان پہنچ سکا۔ رہی سہی کر سواری کی نایابی نے پوری کردی۔ سردی انتہا کی تھی۔ ایک خدا ترس موٹر سائیکل سوار سے لفٹ لے کر جب میں فرزانہ کے گھر پہنچا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

میری ساس صاحبہ نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا اور مجھے گلے سے لگایا۔ "بیٹا جی! ہم تو سمجھے تھے تم آج نہیں آؤ گے۔"

"بس آنٹی! دفتر میں ہی بہت دیر ہوگئی۔ گھر میں فون ہوتا تو آپ کو اطلاع دے دیتا۔"

آنٹی مجھے اندر لے گئیں۔ گھر کے سوتے ہوئے اور اونگھتے ہوئے سبھی مکین اٹھ بیٹھے۔ لال لال آنکھیں، بھاری بھاری آوازیں۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بول رہے تھے مگر شاید دل میں کہہ رہے تھے۔ "تم بیمار پرسی کے لیے آئے ہو یا مزید بیمار کرنے کے لیے؟"

آنٹی نے بڑی محبت سے پوچھا۔ "کھانا کھاؤ گے ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلانا چاہا لیکن پھر فوراً سوچا، اتنی رات گئے اگر کہہ دیا کہ کھانا نہیں کھایا تو معیوب سا لگے گا۔ یہ لوگ سوچیں گے کہ یہ کیسے بے مروت دفتر والے ہیں جو رات گئے تک کام کراتے ہیں اور کھانے کو بھی نہیں پوچھتے۔

"نہیں نہیں آنٹی، کھانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اس کے ساتھ دل ہی دل میں دعا کی کہ آنٹی میرے اس "اخلاقی جھوٹ" کو میرا حتمی فیصلہ نہ سمجھ لیں۔ مجھے امید تھی کہ وہ اصرار کریں گی اور میں ایک بار مزید انکار کرنے کے بعد، دو چار لقمے کھانے کا عندیہ دے دوں گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کسی شامت اعمال کے سبب عین اس وقت جب آنٹی دوبارہ سے کھانے کا پوچھنے والی تھیں، باہر سے سسر ہاشم صاحب کی آواز آئی اور وہ "آئی جی" کہتے ہوئے باہر چلی گئیں۔ تین چار منٹ بعد جب وہ واپس آئیں تو سارا کھیل ہی بگڑا ہوا تھا۔ وہ "کھانے" والی بات شاید بھول ہی چکی تھیں۔ انہوں نے بڑی الفت سے ہمارے ٹھنڈے ٹھار سر پر بوسہ دیا اور بولیں۔ "بیٹا جی! میں نے ساتھ والے کمرے میں آپ کا بستر بچھا دیا ہے۔ انگیٹھی سے کمرا بھی گرم کرا دیا ہے۔ اب جا کر آپ آرام کریں۔ صبح تسلی سے باتیں کریں گے۔"

میں "اچھا جی۔" کہتا ہوا سعادت مندی سے کمرے میں آ گیا۔

امید تھی کہ جلد یا بدیر فرزانہ اپنی جھلک دکھائے گی...... اور اس سے دو چار کھٹی میٹھی باتیں ہو سکیں گی لیکن فرزانہ کے بجائے چھوٹے سالا صاحب جمشید تشریف لے آئے۔ یہ ابھی تک سوئے نہیں تھے۔ ان کی عمر تیرہ چودہ برس تھی۔ کرکٹ کے شوقین تھے۔ کالج کے زمانے میں، میں بھی کرکٹ کھیلتا رہا تھا لہٰذا میرا اور جمشید کا مشترکہ موضوع کرکٹ ٹھہرا۔ ایک دفعہ پہلے بھی اس موضوع پر ہماری بات ہو چکی تھی بلکہ ہم تھوڑی سی کرکٹ کھیلے بھی تھے۔

جمشید کو بالنگ میں نام پیدا کرنے کا شوق تھا۔ میں بھی بری بھلی بالنگ کیا کرتا تھا۔ میں اسے بالنگ کے بارے میں ٹپس دینے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ "جمشید! آپ کے گھر کا صحن کافی بڑا ہے ٹینس بال کے ساتھ صحن میں بھی بالنگ کی پریکٹس کر سکتے ہو۔ دیوار پر نشان لگا لیا کرو یا کوئی چیز وکٹوں کے طور پر رکھ لیا کرو۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کی لینتھ تو صحیح ہے لیکن......"

"لیکن کیا بھائی جان؟"

"آپ کو اچھی لائن کی ضرورت ہے۔ آپ کی گیند عام طور پر دائیں بائیں نکل جاتی ہے۔"

ہم کافی دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ میں بات لائن اور لینتھ کی کر رہا تھا تاہم میری اپنی نظروں کی "لائن لینتھ" بھٹکی ہوئی تھی، فرزانہ کے چہرے کی تلاش تھی۔

خدا خدا کر کے کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد جمشید نے میری جان چھوڑی۔ اس کے بعد فرزانہ کو موقع ملا۔ وہ مجھے شلوار قمیص اور چپل دینے کے بہانے کمرے میں آ گئی۔ دو تین منٹ کے لیے ہم نے "وہی" کیا جو لوگ شادی سے پہلے کرتے ہیں اور بعد میں ہرگز نہیں کرتے...... یعنی پیار! ایک دوسرے کو سونگھا، پرندوں کی طرح ذرا سی چونچ لڑائی۔ اسی دوران میں وہ چیز ہو گئی جو اکثر ایسے موقعوں پر ہو جایا کرتی ہے...... یعنی آہٹ! کوئی آس پاس تھا۔ وہ اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا کر بھاگ گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نئے نکور پھولدار بستر پر بیٹھ گیا۔ اچانک جسم کو جھٹکا سا لگا اور میرا دل چاہا کہ اپنی چندیا پر دو چار تھاپیں خود ہی لگا لوں۔ بڑی حماقت ہو گئی تھی۔

بھوک سے برا حال تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ فرزانہ آئے گی تو اس سے کہوں گا...... "محترمہ! مجھ سے بڑی نالائقی ہوئی ہے۔ میں نے ازراہ اخلاق آنٹی جی کو کھانا لانے سے منع کیا تھا۔ وہ میرے اس سوفی صد رسمی انکار کو پلے سے باندھ بیٹھی ہیں اور مجھے رات کو بھوکوں مارنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ نے آنکھوں کی پیاس تو بجھا دی ہے، اب ذرا پیٹ کی بھوک کا علاج بھی کر دیں۔"

لیکن برا ہوا اس نوجوانی کے جوش کا۔ فرزانہ سے چونچ لڑانے کے چکر میں اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یعنی پیٹ کو بھول گیا۔ کچھ نالائق دانشور جنس کو سب سے طاقت ور جبلت کہتے ہیں جبکہ میرے خیال میں ایسا نہیں۔ جنس کے بغیر بندہ پیٹ بھر کر روٹی کھا سکتا ہے لیکن جس بندے کے پیٹ میں تین چار دن تک روٹی نہ جائے، اس کے لیے جنس بے معنی ہو جاتی ہے۔ اسے حسینۂ عالم بھی دستیاب ہو جائے تو وہ اسے پوچھنے سے پہلے کھانے کے بارے میں سوچے گا۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا فرزانہ کے چلے جانے کا۔ گھڑی دیکھی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ لحاف اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر لیٹ گیا۔ پیٹ میں عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بلیاں لڑ رہی ہوں اور ان لڑتی ہوئی بلیوں کے اوپر جیٹ جہاز پرواز کر رہے ہوں۔ دراصل دوپہر کو بھی میں نے بس تھوڑے سے...... بسکٹ کھا کر چائے پی لی تھی۔ اس سے پہلے ناشتا بھی بالکل واجبی سا کیا تھا۔ لحاف میں چین نہیں آیا تو میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نظر بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھی...... اور گھڑی جیسے رک ہی گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں حساب لگانے لگا کہ صبح ہونے میں کتنے گھنٹے، کتنے منٹ اور سیکنڈ باقی ہیں۔ اچانک احساس ہوا کہ اس طرح چہل قدمی فرما کر میں اپنی بھوک کو اور زیادہ بڑھا لوں گا۔ انگیٹھی بجھ چکی تھی۔ ٹھنڈ بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ مخمل کے لحاف میں گھس کر بیٹھ گیا۔ بلیاں ایک بار پھر برسرِپیکار ہو گئیں۔ کمرے سے باہر چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ سارے مکین سو رہے تھے۔

"یا خدا! یہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ سامنے پہاڑ رات ہے اور پیٹ میں دانہ نہیں۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی دیر بعد بھی نیند نہیں آئی تو پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوبارہ گھڑی دیکھی تو سر پیٹنے کو جی چاہا۔ جسے میں "کافی دیر" کہہ رہا ہوں وہ بس دس پندرہ منٹ نکلے۔ بقول شاعر جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا۔

اس وقت کو کوسنے لگا جب ساس صاحبہ نے کھانے کا پوچھا تھا اور میں نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

تو اب کیا کروں؟ ڈھیٹ بن کر کسی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور گھر والوں سے کہوں...... جی مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ دراصل مجھے بے پناہ بھوک لگی ہے۔ بلکہ میں تو اس وقت کچا آٹا بھی پھانک سکتا ہوں۔ پلیز آپ میرے لیے سات آٹھ روٹیوں اور ڈھیر سارے سالن کا انتظام کر دیں۔ لیکن یہ سارا آئیڈیا بڑا توہین آمیز محسوس ہوا۔

اچانک میرا ذہن اپنے کوٹ کی طرف چلا گیا۔ کوٹ کی جیب میں شاید کچھ ٹافیاں موجود تھیں۔ میں نے جیب ٹٹولی۔ کل تین ٹافیاں نکلیں...... بھوکی بکری کی طرح میں نے یہ تینوں ٹافیاں دس پندرہ سیکنڈ کے اندر چر لیں۔ ان سے پیٹ میں کیا خاک رونق ہوتی، بس منہ کا ذائقہ تھوڑا سا بدل گیا۔ میں ایک بار پھر کوٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ ساری جیبیں کھنگالیں، پھر تھوڑی سی کامیابی ملی جب ایک جیب میں میٹھی سونف کا پیکٹ موجود تھا۔ یہ بھی نعمتِ غیر مترقبہ محسوس ہوا۔ میں بستر پر بیٹھ گیا اور دو تین پھانکوں میں یہ ساری سونف بھی کچر کچر چر لی۔

کہیں سنا تھا کہ ٹھنڈ سے بھوک بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ایک بار پھر اچھی طرح لحاف میں گھس گیا اور بھوک سے دھیان ہٹانے کے لیے صبح کا باسی اخبار پڑھنے لگا۔

پورے اخبار میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی، سوائے دو تین اشتہاروں کے۔ ایک شاہی مرغ حلیم کا اشتہار تھا۔ ایک بریانی ہاؤس اور ایک تکا تک ریسٹورنٹ کا۔

اخبار ایک طرف پھینک دیا۔ بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ بھوک کی خبیث بلی کی طرح اپنے تیز پنجوں سے معدے کو کھرچ رہی تھی۔ دو تین بڑی "خوشبودار" ڈکاریں بھی آئیں۔ خالی پیٹ میں ڈکاریں، واہ، کیا دردناک سچویشن تھی۔

یہ سب سونف کا کرشمہ تھا۔ پھر خیال آیا کہ یہ "سونف ناہنجار" تو بے حد ہاضم ہوتی ہے۔ یقیناً یہی بات تھی جو معدے میں تیز خنجر سے چلنے لگے تھے۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ مصیبت میں بندے سے الٹے سیدھے کام ہی سرزد ہوتے ہیں۔ خالی معدے سونف پھانک کر ہم نے خود کو مزید آفت میں مبتلا کر لیا تھا۔ کمزوری سے سر گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈر لگنے لگا کہ آج ہمیں بھی کہیں وہی خاص بیماری "مینو ہارنی ڈی فوسیا" نہ ہو جائے۔

ایک بار پھر اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ کمرے میں ہر طرف چکرا کر دیکھا، کھانے پینے کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔

لکڑی کی الماری کو بھی سونگھا۔ اس کی خوشبودار وارنش پر دانت آزمانے کو جی چاہا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر دروازے کی درز سے آنکھ لگائی۔ برآمدے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی، ہر طرف سکوت تھا۔ بہت ہولے سے دروازہ کھولا۔ ٹھنڈی ٹھار ہوا نے استقبال کیا۔ ہم برآمدے میں نکل آئے۔ اگر کوئی اس وقت جاگ جاتا تو اسے کہا جا سکتا تھا کہ پیشاب کی حاجت ہوئی ہے۔

کچھ دیر تک برآمدے میں کھڑے جائزہ لیتے رہے۔ سامنے ہی ڈیوڑھی تھی۔ بیرونی دروازے کو اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔ کشادہ صحن کے بیچوں بیچ ایک پیڑ نظر آ رہا تھا۔ نہایت غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ بیری ہے۔ بیری، امرود، جامن اور اس قبیل کے دوسرے پیڑوں کو ہم نے کبھی قابلِ توجہ نہیں جانا تھا لیکن آج اندازہ ہوا کہ اگر پیٹ میں بھوک سے چوہے بلیاں دوڑ رہے ہوں تو پھر ایسے پھلدار پیڑ بڑی نعمت محسوس ہوتے ہیں۔

ہم ٹہلنے والے انداز میں بیری کے نیچے چلے گئے۔ آنکھیں سکیڑ کر نہایت دھیان سے دیکھا۔ پتوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بیر بھی موجود تھے مگر یہ خاصی بلندی پر تھے۔ غالباً نیچے کے بیر بچے توڑ کر کھا چکے تھے۔

ہم نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر دو چار بیر توڑے۔ یہ کچے اور کیس دار تھے...... تاہم ہم کھا گئے اور مزید کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑانے لگے۔ ایک آہنی کرسی موجود تھی، اس پر کھڑے ہو کر بھی چند بیر توڑے۔ ذرا تصور کریں، سخت سردی میں رات کے ڈھائی تین بجے اس گھر کا معزز مہمان بیری سے بیر توڑ توڑ کر کھا رہا تھا...... اور چور نظروں سے اطراف میں بھی دیکھ رہا تھا۔

ان بیروں سے بھلا کیا بنا تھا۔ ہم پھر برآمدے کی طرف آ گئے۔ بھوک اتنی شدید تھی کہ ہم کوئی بھی قابلِ استعمال چیز کھا جانا چاہتے تھے۔ پینٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک کھائی ہوئی چیونگم نکل آئی۔ اسے ہم نے دفتر میں پھینکنے کے بجائے ریپر میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا تھا کہ ڈسٹ بن میں پھینکیں گے۔ اس چیونگم کو بلاتردد پھر منہ میں رکھ لیا اور بکری کی طرح جگالی کرتے ہوئے دوبارہ بیری کی طرف دیکھنے لگے۔ بیری پر چڑھنا ہرگز ہرگز ہمارے بس میں نہیں تھا ورنہ ہم چڑھ جاتے اور شاید پتلی پتلی ٹہنیوں پر بھی پہنچ جاتے...... اور ایک ایک بیر چر جاتے۔

کہتے ہیں کہ بھوک میں بندے کی سونگھنے کی حس بڑی تیز ہو جاتی ہے۔ ہمارا بھی کچھ یہی حال ہو رہا تھا۔ کبھی ہم نے بیر کی خوشبو ایسے نہیں سونگھی ہوگی لیکن اس وقت ہمیں بہت تیز آ رہی تھی۔ یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ گھر کا کچن بائیں طرف ہے اور اس میں آلو انڈے کا سالن پڑا ہے۔ شاید تڑکے والے چاول بھی تھے۔ تو کیا چوری چھپے باورچی خانے میں گھس جائیں اور خاموشی سے چند لقمے لے لیں......؟

لیکن گھر والے جاگ گئے تو کیا ہوگا۔ بات کا بتنگڑ بنے گا۔ فرزانہ کے چچا بھی اسی گھر میں رہتے تھے اور وہ اس منگنی سے اتنے خوش بھی نہیں تھے۔ (اگر یہ منگنی اب تک بچی ہوئی تھی تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ آنٹی حمیدہ والد صاحب کے علاج سے بہت خوش تھیں) تو کیا ہم فرزانہ کے چچا کو منگنی کو خطرے میں ڈالنے کا موقع دے دیں؟

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں جان خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اگر جان ہی نہ رہتی تو منگنی کا ہمیں کیا کرنا تھا۔

ہم کافی دیر تک برآمدے میں کھڑے دیدے گھماتے رہے اور دائیں بائیں دیکھتے رہے۔ آخر حوصلہ جمع کیا اور بڑے محتاط قدموں سے باورچی خانے کی طرف بڑھے۔ ہم نے اس گھر میں پہلی دفعہ قدم رنجہ فرمایا تھا گھر کا نقشہ ہمیں معلوم نہیں تھا مگر ہماری بھوک انگلی تھام کر ہمیں سیدھا کچن کے رخ پر دوڑائے لیے گئی۔ انڈے آلو کی خوشبو تیز تر ہو گئی تھی۔ ہم نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا لیکن دروازہ بھی ایک بدقماش نکلا۔ ہم نے اسے جتنا آہستہ کھولا اس نے چرررر کی اتنی ہی گمبھیر اور کراری آواز نکالی۔ بھوکے جانور کی ساری حسیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ہماری آنکھیں بھی شاید بلبوں کی طرح روشن تھیں۔ تاریکی کے باوجود ہمیں باورچی خانے کے برتن صاف دکھائی دے رہے تھے۔

ہم نے شیلف پر پڑی ہوئی ایک ڈبل روٹی پر باقاعدہ ”مجرمانہ حملہ“ کیا۔ ابھی پانچ چھ بڑے بڑے نوالے ہی لیے تھے کہ ایک بار پھر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر اکثر ہو جاتا ہے...... یعنی آہٹ، کوئی کچن کی طرف آ رہا تھا۔ شاید اسے کوئی شبہ ہوا تھا۔

”یا اللہ خیر۔“ ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی ڈبل روٹی بھی نکل گئی۔

دل کی رفتار ایک دم تین گنا ہو گئی۔ منہ میں ٹھسی ہوئی ڈبل روٹی کے ساتھ ہم باورچی خانے سے نکلے۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھنا چاہا مگر ٹھٹکے۔ آنے والا ہمارے کمرے کی طرف سے ہی آ رہا تھا۔

”کون ہے بھئی؟“ یہ ہمارے سسر ہاشم صاحب کی کرخت آواز تھی۔

گھبراہٹ میں ہم نے ایک باتھ روم میں گھسنا چاہا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ شاید اوپر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔

اب سوچتے ہیں کہ بہتر ہوتا ہم اس وقت سسر صاحب یعنی اپنے ”ہونے والے“ سسر صاحب کے سامنے چلے جاتے اور کہہ دیتے کہ ہم پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچن میں چلے گئے تھے مگر یہ گھبراہٹ بھی بڑی پائے کی چیز ہے، بندے کے سارے حواس کو دم پخت کر دیتی ہے اور آسان کام بھی مشکل تر ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے دل میں ایک اور خدشہ بھی تھا۔ یہ ممکن تھا کہ ہماری اس آدھی رات کی آوارہ گردی سے سسر جی کوئی اور مطلب لے لیتے یعنی اس صورت حال کا رخ فرزانہ کی طرف موڑ دیتے۔

ہم نے دوبارہ کچن میں گھسنے کا سوچا مگر دیر ہو چکی تھی۔ اچانک ہمیں ایک کونے میں چوکور جستی پیٹی پڑی نظر آئی۔ اس کا ڈھکنا پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ غالباً بے احتیاطی کے سبب کھلا رہ گیا تھا۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہر بڑے میں ایک بچہ بھی چھپا ہوتا ہے۔ ہمارے اندر بھی ایک بچہ تھا جو یقیناً سخت ڈرا ہوا بھی تھا۔ پتا نہیں کیا کیفیت تھی کہ ہم ”شامتِ اعمال“ کی پروا کیے بغیر خود کو چھپانے کے لیے پیٹی میں گھس گئے۔ یہ جو آٹے کی پیٹی تھی مگر خوش قسمتی سے اس وقت اس میں آٹا بہت کم تھا۔

سسر جی نے باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ بلب جلا کر دیکھا، پھر سیڑھیوں کا بلب جلایا اور بجھایا، تب انہوں نے باورچی خانے میں تاکا جھانکی کی۔ ہمارا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ شروع میں ہمارا ارادہ ڈھکنا بند کرنے کا نہیں تھا لیکن صورتِ حال کی نزاکت دیکھ کر ہم نے آہستہ سے پیٹی کا ڈھکنا بھی بند کر لیا اور یہی ہماری خاص الخاص حماقت تھی۔

سسر صاحب دیکھ بھال کر واپس چلے گئے۔ ہم کافی دیر تک دم سادھے بیٹھے رہے اور باہر سے ابھرنے والی آوازوں کو سنتے رہے۔ دھیرے دھیرے خاموشی چھا گئی۔ یہ جستی پیٹی قریباً چوکور تھی ایک طرف سے ڈھائی فٹ اور دوسری طرف سے تین فٹ ہوگی۔ گہرائی چار فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس میں تھوڑا سا آٹا بھی موجود تھا۔

آٹھ دس منٹ بعد اپنے اردگرد سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہم نے جستی پیٹی کا ڈھکنا اٹھانا چاہا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اگر طبق اس سے زیادہ ہوتے، بلکہ دس گنا بھی ہوتے تو روشن ہو جاتے۔ پیٹی کے ڈھکنے نے اوپر اٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ امید ہے کہ آپ بھی کچھ کچھ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیا ہوا ہوگا، ان جستی پیٹیوں کے ڈھکنے پر عام طور سے ایک جھولتی ہوئی کنڈی بھی ہوتی ہے۔ ڈھکنا بند ہونے پر اکثر کنڈی خود بخود ہی لگ جاتی ہے۔ یہاں بھی لگ گئی تھی اور ہم اس چند کیوبک فٹ کی ”جستی قبر“ میں قید ہو گئے تھے۔ بڑی فلمی لیکن دردناک صورتِ حال تھی۔

اگلے چار پانچ گھنٹے ہم نے جس طرح گزارے ہمیں ہی معلوم ہے۔ دل و دماغ مفلوج بلکہ فارغ ہو چکے تھے۔ سردی، خوف اور احساسِ ذلت نے پورے جسم کو بے پناہ شدت سے جکڑ لیا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم نے بھوک کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ پھر آپ سوچیں گے شاید اس لیے نہیں کیا کہ ہم نے ڈبل روٹی کے چند لقمے لے لیے تھے۔ ایسی بات ہرگز نہیں۔ اس وقت تک ہماری بھوک مٹی نہیں بلکہ مر چکی تھی۔ اور ایسی مری تھی جیسے ایک چھوٹا سا کتورا بہت وزنی ٹرک کے نیچے آ کر مرتا ہے۔ لگتا تھا کہ اب روزِ قیامت تک ہمیں بھوک نہیں لگے گی اور اگر ہم آج زندہ بچ گئے تو بغیر کھائے پیے مدتوں جیتے رہیں گے۔

وہ بڑی عذاب ناک رات تھی اور ہم نے اسے اپنی شدید بدحواسی سے ایسا بنایا تھا۔ سب سے اچھا تو یہی تھا کہ ہم آنٹی کے پوچھنے پر تکلف نہ کرتے اور کھانے کی آفر قبول کر لیتے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکا تھا تو بعد ازاں فیصلے پر نظرِ ثانی کرتے اور کھانا مانگ لیتے...... اور اگر یہ بھی نہیں ہوا تھا تو پھر کم از کم اس جستی پیٹی میں تو بند نہ ہوتے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بندہ یا تو بہت چالاک ہو یا بالکل چالاک نہ ہو۔ ہماری ”درمیانی چالاکی“ نے ہمیں اس پیٹی میں بند کیا تھا۔ آہ...... کہاں وہ آرام دہ بستر جس پر ہم باوقار لیٹے ہوئے تھے اور کہاں یہ مختصر جستی پیٹی جس میں بیٹھنے سے ہمارے گھٹنے ٹھوڑی سے چھو رہے تھے اور سردی ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔

کئی بار جی میں آئی کہ اپنی منگنی کو لاحق سارے خدشات بالائے طاق رکھ کر پیٹی کو دھڑ ادھڑ بجانا اور چلانا شروع کر دیں۔ مگر یہ جرأت بھی نہ کر سکے۔ بس ایک ہی امید تھی کہ شاید صبح سویرے فرزانہ اس طرف نکل آئے اور اس پیٹی کا ڈھکنا اٹھا لے مگر یہ بہت کمزور امکان تھا۔

نئے زمانے کی لڑکیاں صبح سویرے کہاں اٹھتی ہیں۔ اور آٹے والی پیٹی کا ڈھکنا اٹھانے کی تو انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اگلے تین چار گھنٹے میں ہم بس یہی سوچتے رہے کہ صبح اس پیٹی سے برآمد ہونے کے بعد ہماری منگنی بچ سکے گی یا نہیں؟

☆☆☆

وہ سرد رات ایک صدی سے بس تھوڑی ہی چھوٹی ہوگی۔ ہم صبح کا انتظار کر رہے تھے اور صبح سے بے حد خوفزدہ بھی تھے۔ دھیرے دھیرے جستی پیٹی سے باہر رات نے اپنے پر سمیٹنے شروع کر دیے۔ گھر کے اندر کھٹ پٹ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ پہلے غالباً آنٹی حمیدہ ہی جاگی تھیں۔ پھر سسر ہاشم صاحب کی آواز آئی، وہ وضو کے لیے پانی گرم کرنے کو کہہ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد چڑیوں کی مدھم چہکار بھی ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ یہ آزاد پرندے یقیناً صحن والی بیری پر چہچہا رہے تھے۔ گھر میں چہل پہل کے آثار نمایاں تر ہوتے گئے۔ بزرگوں کے بعد بڑے جاگے پھر بچے۔ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ کوئی بڑا صحن کا ہینڈ پمپ چلا رہا تھا۔ کوئی بچہ باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھوئے جا رہے تھے، کھانسی، ناکوں کی شڑوں شڑوں، غرارے۔ پھر فرزانہ کی باریک آواز کانوں تک پہنچی وہ اپنے بھتیجے سے کہہ رہی تھی۔ ''الو، ساڑھے سات ہو گئے ہیں۔ جلدی ناشتا کرو۔ اسکول ٹائم بدل گیا ہے۔''

سسر جی کی کڑک دار آواز آئی۔ وہ میرے چھوٹے برادران لاء جمشید سے پوچھ رہے تھے۔ ''تم کیا کر رہے ہو، اسکول نہیں جانا؟''

''نہیں ابو، آج میری چھٹی ہے۔'' پیٹی کے بالکل پاس سے اس کی آواز آئی اور ہم بدک کر رہ گئے۔

اتنے میں آنٹی حمیدہ نے برآمدے کے شمالی کونے سے آواز دی ''جمشید، تمہارے بھائی جان کمرے میں تو نہیں ہیں، کہاں گئے؟''

''باتھ روم میں ہوں گے۔'' جمشید ایک بار پھر پیٹی کے بالکل قریب سے بولا۔

''ان کا خیال رکھو۔ اگر انہوں نے نہانا ہے تو صابن تولیا وغیرہ دو۔'' آنٹی نے جمشید سے کہا۔ پھر ہولے سے بولیں۔ ''وہ ذرا نازک طبیعت کے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کو محسوس کر لیتے ہیں۔''

فرزانہ کی مدھم آواز آئی۔ ''تولیا کون سا دینا ہے؟ سارے تو پرانے ہو گئے ہیں۔ اب ان کی ٹاکیاں بنالیں، فرش پر پھیرنے کے لیے۔''

''وہ بڑا والا دے دو۔''

''اس میں بھی کل دو موریاں ہو گئی ہیں۔'' فرزانہ نے کہا۔

چند لمحے بعد آنٹی کی آواز آئی۔ ''اچھا یہ دے دو، تمہارے ابو والا ہے۔''

جمشید ہنسا۔ ''شام کو اس پر بلی بیٹھی ہوئی تھی، تینوں بلونگڑوں سمیت۔''

''تو کیا ہوا، جھاڑ لو ذرا۔'' آنٹی نے دانت پیس کر کہا...... اور شاید کچن کی طرف چلی آئیں۔

دو تین منٹ بعد جمشید کی الجھن زدہ آواز سنائی دی۔ ''امی! وہ تو کہیں بھی نہیں ہیں۔ اوپر نیچے سارے گھر میں دیکھ آیا ہوں۔ انہوں نے شلوار بھی نہیں پہنی ہوئی ہے، وہ ادھر کمرے میں ہی پڑی ہے۔''

''شلوار بھی نہیں پہنی ہوئی ہے۔'' سسر جی نے حیرت آمیز غصے سے کہا۔

''جمشید کا مطلب ہے انہوں نے شلوار پہنی ہی نہیں ہے، پینٹ میں ہیں۔'' بڑے بھائی نوازش نے وضاحت کی۔

''لیکن آخر وہ گیا کہاں؟'' آنٹی حمیدہ کی آواز ابھری۔

دو تین منٹ بھاگ دوڑ، گھومنے پھرنے، دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر جیسے کوئی میرے کان کے پاس آ کے بولا۔ یہ فرزانہ کی پریشان سرگوشی تھی۔ ''کہیں وہ کسی بات پر غصہ تو نہیں کر گئے۔'' وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔

''غصے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ رات کو جمشید سے ٹیبل ٹینس کا میچ کھیلتا رہا ہے۔''

بڑے بھائی صاحب نوازش نے کہا۔ ''میرا خیال ہے جب ابا جی دروازہ کھول کر نماز پڑھنے کے لیے گئے تو وہ بھی سیر کے لیے نکل گئے ہیں۔ لاہور میں بھی وہ صبح سویرے نکل جاتے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' سسر ہاشم صاحب نے بھاری لہجے میں کہا۔

''چلو پھر ان کے آنے تک ناشتا تیار کر لو۔'' آنٹی جی فرزانہ سے مخاطب ہو کر بولیں۔

''کیا بنانا ہے؟'' فرزانہ کی بجھی بجھی آواز آئی۔

''میٹھی سویاں بنالو۔ پر ہمیشہ کی طرح حلوہ نہ بنا دینا۔ رات کا، انڈے آلو کا سالن بھی بچا ہوا ہے...... گرم کر لینا۔ تازہ ہی لگے گا۔ ساتھ میں پندرہ بیس پوریاں منگوا لو۔'' سسر جی نے کہا۔

آنٹی حمیدہ بولیں۔ ''پوریاں کیا کرنی ہیں۔ تھوڑا سا آٹا گوندھ لیتی ہوں۔ فرزانہ نمکین پراٹھے بنالے گی۔''

جی چاہا کہ پکار کر کہوں۔ ''مجھے پراٹھا نہیں کھانا۔ مجھے پراٹھا زہر لگتا ہے بلکہ آٹے سے بنی ہوئی ہر شے زہر لگتی ہے۔ تم پوریاں منگواؤ۔ میری اس پیٹی کا ڈھکن فی الحال بند رہنے دو۔ کیا پتا میرے حق میں کوئی کرشمہ ہو جائے۔''

میں پکار تو نہیں سکا لیکن دل ہی دل میں دعا کرتا رہا جو قبول ہوئی۔ پیٹی سے باہر بحث و تمحیص کے بعد پوریوں کے حق میں فیصلہ ہوا۔ بلا وقتی طور پر ٹل گئی تھی۔ بندے کی بھی کیا فطرت ہے۔ وہ برے واقعات کے ناپسندیدہ انجام سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ انجام ٹل نہیں سکتا پھر بھی اس میں تاخیر چاہتا ہے۔ مثلاً بچپن میں اسکول کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ لامحالہ ہمیں اسکول پہنچنا ہے، اس کے باوجود ہم آہستہ چلتے تھے کہ کچھ اور لمحے آزادی کے گزار لیں، یا شاید اسکول پہنچنے سے پہلے کوئی کرشمہ ہو جائے جس کا حتمی نتیجہ چھٹی کی صورت میں نکلے۔ اب شادی شدہ ہو چکے ہیں اور یہی کیفیت دفتر سے گھر جاتے ہوئے ہوتی ہے۔

پیٹی اوپر ڈھکنے کے پاس سے شاید ٹوٹ گئی تھی کیونکہ اس جگہ خلا تھا جو بالکل سامنے تھا جس میں سے تھوڑی بہت ہوا پہنچ رہی تھی ورنہ شدید گھٹن ہو جاتی اور اگر...... نظام تنفس میں واقعی کوئی ''چربی شربی'' موجود ہوتی ہے تو وہ ساری پگھل جاتی اور نظام تنفس کے ساتھ نظام حیات بھی ٹھپ ہو جاتا۔ تو بات ہو رہی تھی ناشتے کی۔ ناشتا تیار ہو گیا لیکن ناشتا کرنے والا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ آتا بھی کیسے؟ وہ تو گھر کے اندر ہی موجود تھا بلکہ میزبانوں کے عین سامنے پیٹی میں تشریف فرما تھا۔ اس کیفیت کو شاید ہم لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر رہیں۔ ہمارا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا اور سینے میں مسلسل دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک اور ستم ہوا۔ ہمیں یوں لگا کہ کسی نے ہمارے سر پر دستی بم رکھ کر چلا دیا ہے اور چلایا بھی ہتھوڑا مار کر۔ ہم ہڑبڑا کر رہ گئے۔ کتنی دیر تک سمجھ ہی نہیں آئی کہ یہ ہولناک آواز کیسے پیدا ہوئی ہے۔ کافی دیر تک کان شائیں شائیں کرتے رہے۔ کیا اس جستی پیٹی سے باہر قیامت برپا ہو چکی تھی؟ اور اگر ہو چکی تھی تو پھر اہل خانہ نے ابھی تک داعیٔ اجل کو لبیک کیوں نہیں کہا تھا؟ وہ ابھی تک باتیں کیوں کر رہے تھے؟

ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے کہ ایک اور روح فرسا دھماکا ہوا۔ اس بار ہمیں یقین ہو گیا کہ اگر قیامت نہیں بھی آئی تو ہمارے ایٹمی ہتھیار ضرور دہشت گردوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ پورا جسم آواز کی شدت سے پھڑکنے لگا۔

یکا یک منجھلے برادران لاء کے چند الفاظ کانوں میں پڑے اور ہم پر انکشاف ہوا کہ چھوٹے برادران لاء یعنی جمشید صاحب ہماری ہدایات کے عین مطابق صبح سویرے صحن میں ''بالنگ پریکٹس'' فرما رہے ہیں۔ شومیٔ قسمت انہوں نے برآمدے میں رکھی ہوئی اس جستی پیٹی کو وکٹوں کا رتبہ بخش دیا تھا۔ اگلے پانچ دس منٹ جس طرح گزرے، وہ ہم جانتے ہیں یا وہ جستی پیٹی۔ جمشید بالنگ پریکٹس کے لیے ٹیپ بال استعمال کر رہا تھا، اس کے باوجود بال کے پیٹی سے ٹکرانے کی آواز اتنی ہولناک تھی کہ اس پر لوہے کی بال کا شبہ ہوتا تھا۔ درحقیقت چاروں طرف سے بند جستی پیٹی کے اندر ٹکراؤ کی آواز کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ ہمارا یہ اندازہ بھی غلط تھا کہ جمشید کی ''لائن'' اچھی نہیں ہے۔ کم بخت کی پھینکی ہوئی پانچ گیندوں میں سے چار سیدھی پیٹی میں لگ رہی تھیں اور ہر بار جب گیند پیٹی میں لگتی تو گویا ہمارے سر پر ایک عدد ہائیڈروجن بم پھٹتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ہائیڈروجن بھی ہمارے ستم زدہ سر پر گرتی تھی۔ یہ دراصل وہ خشک آٹا تھا جو پیٹی کے ڈھکن سے جھڑتا تھا اور ہمیں بھوت بناتا تھا۔

جمشید اپنی ترنگ میں بال کرانے کے ساتھ ساتھ خود ہی کمنٹری بھی کر رہا تھا۔ ''جمشید صاحب اپنے بالنگ نشان کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ گیند کو چمکاتے ہوئے۔ وہ رکے...... مڑے...... ایک بار پھر لیسٹرین اینڈ کی طرف سے دوڑتے ہوئے آئے...... وکٹوں کے پاس پہنچے...... اچھلے...... گیند کی...... اور بولڈ...... کلین بولڈ۔''

اور پیٹی کے اندر ہم بھی بولڈ...... بلکہ کلین بولڈ......

کہیں پڑھا تھا کہ گستاپو، موساد اور کے جی بی جیسی تنظیموں کے لوگ اپنے مجرموں کو سزا دینے کے لیے انہیں اسی طرح سے باندھ کر نلکے کے نیچے بٹھا دیتے تھے کہ ان کے سروں پر پانی کا ایک ایک قطرہ مسلسل گرتا رہتا تھا اور دھیرے دھیرے یہ گرتا ہوا ایک قطرہ ان کی کھوپڑی میں دھماکے شروع کر دیتا اور وہ بدترین اذیت سے دوچار ہو جاتے تھے۔ آج اس کڑکڑاتی پیٹی کے اندر یہ ''نوخیز کرکٹر'' بھی ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کر رہا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ یہ سب کچھ ہماری ہدایات کے عین مطابق کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہمارے سسر صاحب بالائی منزل سے نیچے آئے تو انہوں نے جمشید کو ڈانٹا۔ ''اوئے! کھوتے دے پتر، کیوں پیٹی کا بیڑہ غرق کر رہا ہے؟''

یوں کھوتے دا پتر باز آیا اور اس کا یہ نہایت مہلک ''بالنگ اسپیل'' اختتام پذیر ہوا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ

''بالنگ اسپیل'' دو چار منٹ اور جاری رہتا تو ہم الامان پکارتے ہوئے خود ہی باہر نکل آتے۔ اس موقعے پر مدھم آواز میں تھوڑی سی کمنٹری منجھلے بھائی نے بھی کی...... ''جمشید صاحب بڑی گندی بالنگ کرا رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہیں اباجی سے بڑی عمدہ ڈانٹ پڑی ہے۔ اس ڈانٹ سے جمشید صاحب کا پٹھا چڑھ گیا ہے اور وہ ان فٹ ہو کر پویلین واپس جا رہے ہیں۔ ان کے دونوں کان لال لال ہیں......''

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ہمارے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ پورا جسم پسینے میں نہا چکا تھا۔ امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ گھر والے اب شپٹا سے گئے تھے۔ فرزانہ کے بڑے بھائی نوازش نے کہا۔ ''سلیم بھائی ایسے غیر ذمے دار تو نہیں۔ کہیں فرزانہ کی بات ہی تو صحیح نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے...... وہ کسی بات پر ناراض ہی نہ ہو گئے ہوں؟''

''یا پھر، نیند میں چلنے کی عادت ہوگی۔'' فرزانہ نے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔

''تمہیں مذاق سوجھ رہے ہیں۔ میرا دل ہول رہا ہے۔'' آنٹی حمیدہ نے کہا۔ ''جاؤ، کہیں ڈھونڈو اُسے۔''

''ڈھونڈیں کہاں؟ کچھ پتا ہو تب ہے ناں۔'' سسر جی بولے۔

''کوئی یار دوست تو نہیں تھے بھائی جان کے یہاں؟'' منجھلے بھائی صاحب نے کہا۔

''ہمیں کیا پتا؟ کیا تھا اور کیا نہیں تھا؟'' فرزانہ کے چچا کی بیزار آواز ابھری۔

''بڑی عجیب سی بات لگتی ہے۔'' چچی نے لقمہ دیا۔

''اچھا جائیں، آپ تو ناشتا کریں۔'' نوازش نے شپٹا کر کہا۔

''میں تو نہیں کھاتی یہ لاہوری پوریاں شوڑیاں۔ میں تو روٹی پکاؤں گی۔'' چچی نے بھی بیزاری سے جواب دیا، پھر انہوں نے آنٹی حمیدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپا! یہ تھوڑا سا آٹا نکال کے دینا مجھے۔''

ہمارا کلیجا اچھل کر منہ میں آگیا۔ کوئی کرشمہ نہیں ہوا تھا۔ آخر وہ وقت آپہنچا تھا جو ہمیں کئی گھنٹے سے دہشت زدہ کر رہا تھا۔ کاش سلیمانی ٹوپی ہوتی اور ہم اسے چند سیکنڈ کے لیے پہن لیتے۔ ہماری ساس صاحبہ بھاری قدموں سے چلتی، آٹے والی پیٹی تک پہنچیں۔ انہوں نے ڈھکنا اٹھایا۔ انہوں نے ہماری طرف، ہم نے ان کی طرف دیکھا، چند لمحوں کے لیے ان کا چہرہ بالکل بے تاثر رہا۔ کائنات کی گردش تھم سی گئی تھی...... یا جیسے کسی مووی کا کوئی سین اپنی جگہ ساکت ہو جائے۔

ہمارے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں پھڑکے یا شاید رونے والے انداز میں۔ اس کے بعد آنٹی حمیدہ نے ایک ہولناک آواز بلند کی، اس آواز کو ہاتھی کی چنگھاڑ، شیر کی دہاڑ اور ذبح ہونے والے جانور کی پکار سے علیحدہ علیحدہ تشبیہ دی جاسکتی ہے اور مشترکہ طور پر بھی۔

ہمیں لگا کہ آج یہاں صبح نو بجے گوجر خان کے اس مکان میں صورِ اسرافیل پھونک دیا گیا ہے اور زمین آسمان کے قلابے تھوڑی ہی دیر بعد آپس میں ملنے والے ہیں۔

آنٹی حمیدہ پشت کے بل گری تھیں۔ گرتے ہوئے ان کا سر سسر جی کے گھٹنے اور کرسی کے پائے سے ایک ساتھ ٹکرایا اور سسر جی بھی شریکِ حیات کے ساتھ ہی لڑھک گئے اور بات صرف آنٹی حمیدہ تک ہی محدود نہیں تھی، آٹے کی پیٹی سے ہماری ''رونمائی'' پر باقی اہلِ خانہ نے بھی حسبِ توفیق اور طاقت بھرپور ''خوشی'' کا اظہار کیا۔ وہ پوری قوت سے چلائے تھے۔ کچھ اضطراری عمل کے طور پر بیرونی دروازے کی طرف بھی بھاگے لیکن پھر سنبھل گئے۔ شاید کسی نے ہمارے سر پر لٹھ وغیرہ مارنے کا بھی سوچا ہو۔ سمجھیے کہ ایک لمحے کے لیے قیامت سی برپا ہوگئی۔ ہم خشک آٹے میں لتھڑے ہوئے اچھل کر باہر آئے اور اپنی ساس صاحبہ کی طرف لپکے۔ وہ چاروں شانے چت تھیں اور انٹا غفیل ہو چکی تھیں۔

''...... آنٹی......'' ہم دیے [illegible] انہیں جھنجوڑا مگر ان کے بے ہوش ہونے کی جداگانہ صلاحیت پورے طمطراق سے واپس لوٹ آئی تھی۔ وہ ایسے بے ہوش ہوئی تھیں کہ مردہ بھی ان کے پہلو میں پڑا ہوتا تو آنٹی زیادہ قابلِ رحم محسوس ہوتیں۔

سسر جی نے ہمیں وحشت زدہ و قہرناک نظروں سے گھورا پھر بڑے بیٹے سے مخاطب ہو کر دہاڑے۔ ''نوازش! دوڑ کے دوا لاؤ...... جلدی کرو۔''

نوازش لڑکھڑاتا ہوا کمرے کی طرف بھاگا۔ چند ہی لمحے بعد وہ اباجی کی عطا کردہ کوئی نصف درجن ہومیو پیتھک دواؤں کے ساتھ نمودار ہوا۔ کوئی ٹپکانے کی دوا تھی، کوئی سونگھانے کی اور کوئی ملنے کی۔ ساری دواؤں نے ایک سا کام کیا یعنی سب ناکام رہیں۔ میرا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اس گھر میں اگر میری شادی ہو رہی ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ والد صاحب کے وعدے کے عین مطابق آنٹی حمیدہ اور ان کی ''بے ہوشی'' ایک دوسرے سے جدا رہی ہیں۔ اب یہ ''ملاپ'' ہو گیا تھا اور ایسا سنگین ہوا تھا کہ والد صاحب کی دوائیں اور وعدے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر تو یہی ہوا تھا۔ سارے اہل خانہ مجھے بے حد خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے، ان کی آنکھوں میں کئی طرح کے سوال تھے۔

ہم اگلے روز اپنی ساس صاحبہ سمیت گوجر خان سے لاہور واپس آگئے...... ساس یعنی آنٹی حمیدہ کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر لایا گیا تھا۔ ان پر بار بار بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی...... لاہور آنے کے بعد چار پانچ روز تک قبلہ والد صاحب نے آنٹی حمیدہ پر ہر حربہ آزمایا۔ ہر معتبر اور غیر معتبر دوا دے کر دیکھی لیکن آنٹی کی مجموعی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ ان دنوں میں نے پہلی بار والد صاحب کو کسی ''مرض'' کے ہاتھوں اتنا لاچار دیکھنا تھا۔ مجھے تو ڈر تھا کہ انہیں خود بھی ''میخو ہارنی ڈی نوسیا'' قسم کی کوئی چیز نہ ہو جائے۔

آنٹی قدرے سنبھل گئیں تو سسر ہاشم صاحب اور بھائی نوازش انہیں پریشانی کے عالم میں واپس گوجر خان لے گئے۔ والد صاحب کے لحاظ سے بھی ہمارے تعلقات دگرگوں تھے۔ انہیں ساری بات کا پتا چل چکا تھا۔ وہ طیش کے عالم میں پہلے بھی ہمیں کئی بار پرلے درجے کا چغد اور ناکارہ قرار دے چکے تھے۔ اب اپنے اس کارنامے سے ہم نے ان کے خیالات پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہتے رہتے تھے...... حمیدہ کی صحت وہ شاخ تھی جس پر تیری منگنی کا آشیانہ تھا۔ تو نے اپنی بے مثال حماقت سے وہ شاخ ہی جلا دی ہے ناہنجار۔

والد صاحب کے علاوہ سارے اہل خانہ بھی حیران تھے کہ آخر ہم سے اتنی بے وقوفی والا کام کیسے ہو گیا۔ میں ان سب کو ایک ہی جواب دیتا تھا۔ ''آپ کبھی بھوکے پیٹ سونف کھا کر دیکھیں...... پھر پتا چلے گا۔''

ادھر گوجر خان میں آنٹی حمیدہ کی طبیعت والد صاحب کی دواؤں کے باوجود مسلسل خراب رہی وہ بدستور بے ہوش ہو رہی تھیں۔ پہلے آٹے کی پیٹی دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ پیٹی وہاں سے ہٹالی گئی...... تو صرف آٹا دیکھ کر بے ہوش ہونے لگیں۔ آٹا بھی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تو آٹے کی روٹی دیکھ کر بے ہوشی فرمانے لگیں۔ ان کا دل واقعی بے حد کمزور ہو گیا تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے میری اور فرزانہ کی منگنی کو برقرار رکھنے والی واحد شے آنٹی حمیدہ کی صحت تھی۔ یہ صحت نہ رہی تو منگنی بھی شدید طوفان کی زد میں آگئی۔ فرزانہ کے چچا، چچی پہلے ہی کسی ایسے موقعے کے منتظر تھے۔ انہوں نے ایسی پرزور مہم چلائی کہ سب کچھ درہم برہم ہو گیا۔ فرزانہ کے لیے خاندان ہی کے ایک اور لڑکے کا نام لیا جانے لگا جو خاصا ہینڈسم بھی تھا۔

وہ بڑے تکلیف دہ دن تھے۔ مگر کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ان نہایت ناسازگار حالات میں فرزانہ اپنے اہل خانہ کے سامنے ڈٹ گئی۔ اس کے ڈٹ جانے کی پوری تفصیل تو ہمیں معلوم نہیں۔ بس اس نے اس قسم کی بات کہی کہ پریشان ہو کر آٹے کی پیٹی میں گھس جانا کوئی ایسا بڑا جرم نہیں جس کی ایسی سنگین سزا دی جائے اور یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا ہے۔ سلیم کے خاندان میں اس قسم کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اس سے پہلے کوئی پیٹی میں گھسا ہے نہ اس میں سے برآمد ہوا۔

فرزانہ کے بڑے بھائی نوازش نے اس موقعے پر کہا۔ ''اور اگر بالفرض محال یہ جرم ہے تب بھی مجرم کو غیر مشروط معافی نہیں دینی چاہیے، کم از کم فرزانہ کو اس سے شادی تو ضرور کر لینی چاہیے۔''

آج کل کی اولاد والدین کو لاجواب کر دیتی ہے۔

نوازش اور فرزانہ کے والدین بھی لاجواب ہو گئے۔

آج فرزانہ میری بیوی ہے اور دو بچوں کی امی جان بھی۔ بڑے بچے کی عمر آٹھ سال کے قریب ہو چکی ہے۔ وہ بڑی سیانوں والی باتیں کرتا ہے۔ کل پڑھتے پڑھتے مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ''ابو جان! یہ تکلف کیا ہوتا ہے؟''

ہم نے چند لمحے سوچ کر کہا ''ندیم بیٹا، تکلف کا مطلب ہوتا ہے راہ و رسم کی خاطر وہ کچھ کرنا جو آپ کے دل میں نہیں ہے۔''

''فار ایگزیمپل؟'' اس نے مثال چاہی۔

ہم نے طویل، ٹھنڈی سانس لی۔ ''مثلاً یہ کہ کوئی شخص رات کے وقت کسی کے گھر مہمان جائے، بڑی سخت سردی ہو اور اسے بھوک بھی لگی ہو۔ میزبان پوچھے، کھانا کھائیں گے، وہ رسماً انکار کر دے اور پھر ساری رات بھوک سے بلکتا رہے...... تڑپتا رہے۔''

دروازے کی طرف سے بیگم فرزانہ کی آواز آئی۔ ''پھر چوری چھپے باورچی خانے کی طرف جائے اور پکڑے جانے کے ڈر سے آٹے کی پیٹی میں گھس جائے۔''

ہمارا چہرہ پہلے تو غصے سے سرخ ہوا پھر ہم کھسیانے انداز میں ہنسنا شروع ہو گئے...... بیگم بھی ہنسنے لگیں۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر ندیم بھی ہنسنے لگا۔ ہمارے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''آٹے کی پیٹی میں گھسنے والی بات خوب ہے۔ ایسے بے وقوف کھوتے کو تو خوب ڈنڈے مارنے چاہئیں۔''

''بے شک'' فرزانہ نے کہا اور منہ پھیر کر قہقہہ روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆